Volume 03, Issue 04,
October-December 2025
PP: 54-61
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X
https://doi.org/10.63283/IRJ.03.04/61

اشفاق احمد کے افسانوی مجموعے "صبحانے افسانے" میں پنجابی ثقافت کی عکاسی

The Representation of Punjabi Culture in Ashfaq Ahmed's Short Story Collection "Subḥānay Afāsānay"

Dr. Israr Ahmad[1], Dr. Amna Rafiq[2], Dr. Mohsin Nawaz Basra[3]

Article History

Received
03-12-2025

Accepted
29-12-2025

Published
31-12-2025

Abstract & Indexing

Abstract

Culture represents the intellectual and material expressions of human communities living within a specific geographical region. Its intellectual dimensions shape both the inner and outer aspects of life, guiding individuals in the art of living and sustaining social relationships. These elements influence customs associated with festivals, fairs, and significant events related to life and death. Similarly, the patterns developed by a community to regulate both internal thought and external behavior constitute its traditions and customs. To preserve and transmit these traditions, each generation educates the next, ensuring cultural continuity. Society, therefore, emerges as a collective and comprehensive process in which individuals adhere to an established way of life. This cultural framework operates simultaneously at both internal and external levels, shaping beliefs as well as social practices. Culture is not static; it is continuously influenced by multiple factors that shape and reshape it over time. Historical circumstances, natural calamities, political forces, and social movements all play a significant role in the formation and organization of cultural identity. In this context, the depiction of Punjab in Ashfaq Ahmed's short stories provides valuable insight into twentieth-century Punjabi society. His fiction reflects the cultural values, traditions, and social forces prevalent during his era. Through his portrayal of everyday life, Ashfaq Ahmed captures both individual experiences and collective realities, offering a vivid representation of Punjabi culture and its evolving social landscape.

Keywords:

Ashfaq Ahmad, Short Stories, Subhany Afsany, Culture, Punjabi Culture.

[1] *Lecturer, Department of Urdu and Iqbal Studies, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalnagar Campus. israr.ahmed@iub.edu.pk*
[2] *Assistant Professor, Department of Urdu, The University of Lahore, Lahore.*
[3] *Visiting Lecturer, The Islamia University of Bahawalpur, Bahawalnagar Campus.*

All Rights Reserved © 2025 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

ملخص:

ثقافت کسی علاقے یا خطے میں پائے جانے والے انسانی گروہ کے فکری اور مادی مظاہر کا اظہار ہوتی ہے۔ فکری امور داخل اور خارج پر اثرانداز ہو کر زندگی گزارنے اور رشتوں کو نبھانے کا گُر سکھاتے ہیں۔ تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور موت و حیات کے موقعوں کے جملہ امور کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی طرح داخل اور خارج، یعنی فکر اور اس پر مبنی امور چلانے کے جو سانچے کوئی گروہ تشکیل دیتا ہے اُن سانچوں جن کو روایات یا رسوم کہا جاتا ہے اُن کے دفاع اور تحفظ کے لیے آنے والی نسلوں کو اس کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ گویا سماج کلی اور ایک اجتماعی عمل ہے جس میں فرد ایک سدھائی ہوئی روش پر عمل کرتے ہیں۔ یہ روش داخل اور خارج دونوں سطحوں پر برابر اور ایک ہی لمحے کام کرتی ہے۔ ثقافت پر بہت سے عوامل اثرانداز ہوتے ہیں جو اسے اپنے ساتھ موڑتے اور توڑتے رہتے ہیں، وقت اور حالات، آفات اور سوچ بچار کے عوامل یعنی سیاست اور سماجی تحریکیں یہ سب ثقافت کی تشکیل اور ترتیب کا بندوبست کرتے ہیں۔ ثقافت انہی عوامل کی بدولت بدلتی اور نکھرتی رہتی ہے۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں پائی جانے والی پنجاب کی صورت بیسویں صدی کے پنجاب پر روشنی ڈالتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں موجود ثقافتی مظاہر و عوامل فرد اور معاشرے کی وہ صورت پیش کرتے ہیں جو اُن کے معاصر رواں رہی۔

کلیدی الفاظ: اشفاق احمد، افسانے، صبحانے افسانے، ثقافت، پنجابی ثقافت، ثقافتی عناصر

پنجاب کی سرزمین گو مختلف مذاہب اور فکر کے حامل افراد کا مسکن ہے مگر تہذیبی عمل اور سماجی طرز رہن سہن میں ان تمام طبقوں اور فرقوں میں مماثلت و مطابقت پائی جاتی ہے۔ خاندان اس سماجی نظام کی اکائی ہے۔ اس خاندان میں مرد کو سربراہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور سماجی نظام پدرسری اُصولوں پر چلتا ہے۔ خاندان میں والد بزرگ کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ خاندانی اہم فیصلوں اور میل ملاپ میں اُصول اور ضوابط یہی سربراہ طے کرتا ہے۔

سماج رویوں اور افکار کے رنگ برنگ پھولوں کی ایک ایسی مالا ہے جس میں ہر پھول ثقافت کی ڈوری سے پیوست بھی ہے، متفرق بھی ہے اور مماثل بھی۔ فرد ایک معاشرے میں رہتے ہوئے اُس معاشرے کی ثقافتی بندشوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے رویوں کو ترتیب دیتا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے جابجا خاندان کے سربراہ والد کے مختلف رویوں کے ثقافتی رنگوں سے مزین ہیں۔ ماں اور باپ کسی خاندان کے لیے اُس گھنے بڑ کے پیڑ کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے سائے کی وسعت میں چلملاتی دھوپ کو ایک محفوظ چھت کی مانند جذب کر لیتا ہے۔ یہ والد سربراہ بھی ہے اور کفیل بھی، جو محنت سے اپنے خاندان کے لیے رزق اکٹھا کرتا ہے اور اُنہیں پالتا ہے، اُن کے ناز نخرے بھی اُٹھاتا ہے اور اپنی شفقت کی چھایا سے تحفظ اور زندگی بسر کرنے کے لیے اعتماد بھی دیتا ہے۔ شفقت اور محبت کا یہ رنگ اشفاق کے کئی افسانوں میں پایا جاتا ہے۔

والدین دُنیا کی عظیم نعمت ہیں۔ باپ تحفظ و اعتماد کی علامت ہے تو ماں محبت کا گھنا سایہ۔ ماں اور باپ انسان کی زندگی اور شخصیت کے پُر خلوص معمار ہوتے ہیں۔ ماں باپ اپنی شفقت اور خلوص سے فرد کے فکر و جسد کو سینچتے اور پالتے ہیں، مگر کسی معاشرے میں رہتے ہوئے فرد معاشرتی بندشوں کو پسِ پشت نہیں ڈال سکتا۔ اُس کے ہر لمحے اور ہر ادا میں معاشرتی روش و تہذیب شامل ہوتے ہیں۔ پنجاب میں والد کی سختی اور شفقت کے متوازی محبت اور ایثار کے بھرپور جذبات مامتا کی آغوش سے اولاد کی کردار سازی کرتے ہیں۔ ماں عمومی طور پر گھریلو ذمہ داریاں نبھاتی ہے اور باپ کسب معاش سے گھر کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ ماں محبت اور ایثار کا منبع ہونے کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر ایک بے ضرر فرد کی مانند مردوں کے فیصلوں کو مانتی اور تعمیل و عملی جامہ پہناتی ہے۔ خود دُکھ کی تلملاتی دھوپ جھیلتی ہے اور اہلِ خانہ کے لیے سکھ کا سامان کرتی ہے۔ گھر کی خادمہ، شوہر کی معاون و مشیر اور گھر کی محافظ کے یہ روپ اشفاق احمد کے افسانوں، سردار بیگم، توبہ، امی، چاند کا سفر اور بابا میں ثقافتی و تہذیبی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

سردار بیگم دراصل اشفاق احمد کی والدہ کا افسانوی خاکہ ہے جو انہوں نے اُن کی سادگی، خلوص اور متوکل زندگی کو امر کرنے اور خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے لکھا ہے۔ گھر کے آنگن میں ماں کی اہمیت، شوہر کی سخت طبیعت اور خدمت گزاری کی تصویر کشی میں اس افسانہ میں اشفاق احمد نے پنجاب کے گھر کا ایک عمومی نقشہ کھینچ دیا ہے، جس کو ماں کی ممتا نے سجایا اور بسایا ہوا ہے۔ ممتا اور بیسویں صدی کے نصف اول کی ماؤں کا اخلاص اور فرض شناسی کی مثال درج ذیل ہے:

''اس زمانے میں بچے نوکر نہیں پالتے تھے، مائیں پالتی تھیں۔ غریب مائیں، امیر مائیں، بھونڈی مائیں، پھوہڑ مائیں اور اپاہج مائیں، پاک باز مائیں اور طوائف مائیں سبھی اپنے بچے خود پالتی تھیں۔ ان کے پاس بچے پالنے کا سستا اور آسان نسخہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بچے اپنی ماں کے چالیس پینتالیس گز کے ریڈیس میں کہیں جاتے، کہیں بھی ہوتے، کہیں کھیلتے ان کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا تھا کہ مشکل وقت میں ان کی پکار پر اماں بجلی کی طرح جھپٹ کر مدد کے لیے آموجود ہو گی اور وہ اپنی مشکل اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر گھر کے اندر کسی محفوظ کونے میں پہنچ جائیں گے۔ اس زمانے میں مائیں بچوں کو اپنی عقل و دانش سے یا نفسیاتی ذرائع سے یا ڈاکٹر سپوک کی کتابیں پڑھ کر نہیں پالتی تھیں بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح اپنی ممتا کے زور پر پالتی تھیں۔ بچے بھی کھلونوں، تصویروں، ماؤں کی گودیوں اور لمبی لمبی کمیونٹی کمیشنوں کے بغیر پروان چڑھتے تھے۔ ان کے پاس یقین کی ایک ہی دولت ہوتی تھی کہ ماں گھر پر موجود ہے وہ ہر جگہ سے ہماری پکار سن سکتی تھی۔ جس طرح پکے پکے خدا پرست کو پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے حلقے میں ہر وقت موجود ہے اور وہ جب پکارے گا، رگ جان سے بھی قریب پائے گا اسی طرح بچے کو بھی اپنی پکار اور ماں کے جواب پر مکمل بھروسہ ہوتا تھا!''[1]

پنجاب کے پکے مکانوں اور عمومی صحنوں کا منظر اور ماں کی ممتا، خدمت گزاری، ایثار اور محبت کا ثقافتی منظر بھی اسی افسانے میں مہارت سے کھینچا گیا ہے۔ جہاں رسوئی کے جملہ امور اور خدمت گزاری کے تمام تقاضے بلا معاوضہ و احسان پورے کیے جاتے ہیں۔

''اماں کا چولہا کھلے صحن میں تھا۔ نہ اس پر دھوپ سے بچنے کی کوئی اوٹ تھی نہ بارش سے بھیگنے میں کوئی رکاوٹ۔ چودہ مرلے کے کھلے آنگن میں آسانی سے ایک چھتی ہوئی رسوئی بن سکتی تھی لیکن پتہ نہیں ابا جی نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اماں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھٹیوں کی طرح گرم اور الاؤ سے زیادہ سرخ چولہوں کے پاس بیٹھ کر مزے سے روٹی پکایا کرتیں اور ہم اپنا اپنا کھانا اُٹھا کر برآمدے میں پنکھے تلے چلے جایا کرتے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کی دھار نمودار ہوتی تھی تو وہ ہاتھوں میں پیڑا پکڑے پکڑے آستین سے اپنا چہرہ پونچھ لیتیں لیکن جب ان داروں کا دو آبہ قابو سے باہر ہو جاتا تو وہ اپنے کھردرے دوپٹے کا ''بنوں'' سا بنا کر اس سے اپنا شرابور چہرہ رگڑ رگڑ کر خشک کر لیتیں۔ اگلی روٹی پر پھر یہی عمل دوہرانا پڑتا۔ آفتاب بھائی اگر گھر پر ہوتے تو وہ چولہے کی دیوار کے ساتھ ایک منجی کھڑی کر کے اس پر مجنوں ڈال دیتے اور اماں کے لیے سایہ مہیا ہو جاتا۔ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کے حصول میں بھی کوشاں تھے اور اماں ہمہ وقت ہماری خدمت گزاری پر مامور تھیں۔''[2]

ماں کا کردار اشفاق احمد کی زندگی سے نکل کر جب افسانوں کی زینت بنتا ہے تو یہ ماں بھی پنجاب کے سماج سے تعلق رکھتی ہے، جو اپنی اولاد کی اصلاح کا بیڑا بھی اُٹھاتی ہے اور پرورش و پیدائش کی آزمائش سے بھی نبرد آزما ہوتی ہے۔ افسانہ ''توبہ'' میں یہی ماں کا کردار اپنی اولاد کی اصلاح کے لیے اس کی حرکات و سکنات سے باخبر رہنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور جب پتا چلے کہ اولاد کی حرکات ادب، آداب سے منحرف کر رہی ہیں تو سدِ

باب بھی کرتا ہے، چاہے وہ روپوں کی لالچ دے یا سر کی قسم ڈالے کسی نہ کسی بہانے فرمائشوں کی تعمیل و تکمیل کے لابھ اور وعدوں سے وہ اولاد کی محافظ و نگران بن کر اس کی اصلاح میں مشغول نظر آتی ہے۔

ماں کی بے لوث مامتا کی ایک ثقافتی تصویر افسانہ ''چاند کا سفر'' میں پیش کی گئی ہے، جو کہ اشفاق احمد کی زندگی کے ایک حقیقی واقعہ سے منسوب ہے۔ اس افسانے میں بانو قدسیہ کی مامتا پنجاب کی سرزمین کی تاثیر رکھتی ہے، جو انیق کے بیمار پڑ جانے پر کمزور اور خائف ہے اور اس کی خاطر آنسو بہا رہی ہے، محبتوں کو نچھاور کر رہی ہے۔

شادی کے لیے بر کے انتخاب کے بعد مقررہ تاریخ پر شادی کا آغاز ہوتا ہے۔ شادی کا باقاعدہ آغاز مہندی کی رسم سے ہوتا ہے۔ مہندی کی رسم میں خاندان کی خواتین، مرد اور بچے سب شامل ہوتے ہیں۔ گھر میں خوب رونق ہوتی ہے۔ ڈھول کی تھاپ پر لڑکوں کا ناچ اور ڈھولک پر گِدا (پنجاب کا مخصوص اور روایتی ناچ) ڈالا جاتا ہے۔ اس ناچ میں لوک گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ بزرگ بڑے بھی نوجوانوں کے ہمراہ ناچ گِدے میں شامل ہوتے ہیں۔ مہندی اور ناچ کا یہ منظر اشفاق احمد کے افسانہ ''بیک گراؤنڈ'' میں پورے روایتی اور ثقافتی انداز میں بیان کیا گیا ہے:

> ''عابد کی پوتی بشریٰ کی مہندی تھی اور لڑکے والے مہندی لے کر آ رہے تھے۔ اندر شیشوں والے ہال میں ہماری طرف کے لڑکے اور لڑکیاں ہائی فائی میوزک کے ساتھ ہلا گلا کر رہے تھے اور ناچ کی نئی نئی قسموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بھنسیریاں ڈالتے ہوئے بڑے بڑے ٹوکے مار رہے تھے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں زمین پر اور کچھ صوفوں پر پھسکڑا مار کر ایک دوسرے کو خفیہ قسم کے لطیفے سنا رہے تھے اور دوسروں کے منہ سے بوتلیں کھینچ کھینچ کر لمبے لمبے گھونٹ بھر رہے ہیں۔ سارا ہال دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور تھوڑی دیر بعد یہ خبر آ رہی تھی کہ لڑکے والے تیار ہو رہے ہیں۔ لڑکیاں لڈی کی آخری ریہرسل کر رہی ہیں۔ مہندی سج گئی ہے۔ موٹریں قطاروں میں کھڑی ہو گئی ہیں۔ صرف لڑکے کے والد ای سی جی کرانے کلینک گئے ہوئے ہیں، جونہی واپس آئے تو قافلہ روانہ ہو جائے گا۔''[3]

گیت سنگیت کے لیے جہاں لڑکے لڑکیوں اور جوانوں میں جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، وہاں کہیں کہیں اور عموماً اشرافیہ میں ایسے موقعوں پر پیشہ وروں کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔

> ''تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان سی، خوبصورت، بھری بھری اور چمک دار لڑکی آ کر میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھورے بھالو کی کھال کا پرس تھا، ذرا گھبرائی ہوئی سی ہائی فائی میوزک کے شور میں اس نے اپنی آواز اونچی کر کے اور سر نیچا کر کے مجھ سے پوچھا ''انکل میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟''
>
> سارا صوفہ خالی پڑا ہوا تھا لیکن میں نے تھوڑا سا سرک کر اسے بیٹھنے کی اجازت دی تو میرے ساتھ بیٹھ کر بولی ''میرا نام سوزی ہے اور میں یہاں مجرا کرنے کے لیے آئی ہوں۔''
>
> ہمارے زمانے میں ذرا بڑی عمر کی عورتیں مجرا کرنے آیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک دو نوچیاں بھی ہوتیں لیکن وہ سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر مجرا دیکھا کرتیں، خود نہیں ناچتی تھیں۔ میں نے کہا ''تم اکیلی آئی ہو؟'' تو اس نے سر ہلا کر کہا ''نہیں جی، سازندے بھی ساتھ ہیں اور وہ باہر دیگوں والے کے پاس بیٹھے ہیں۔''[4]

شادی میں جوش اور جذبہ، محبت و ملن کا جذبہ اس کے اہم عناصر ہیں۔ شادی بیاہ کے ان موقعوں میں رنجشوں، گِلوں شکووں کی خلیجوں اور دوریوں کو پاٹنے اور غم و مسرت کے بانٹنے کا بہانہ بھی ملتا ہے۔ تمام کا تمام خاندان مہندی، بارات، رخصتی اور دیگر رسموں میں پر جوش انداز سے شامل ہوتا ہے، ننھیال، ددھیال اور عزیز و اقارب سب مل کر خوشی کے گیت گاتے ہیں ان گیتوں کے موضوعات اور مناظر بھی اشفاق احمد نے

اپنے افسانوں میں سموئے ہیں۔ مائیں، ماسیاں، پھپھیاں، چچیاں اور تائیاں سب مہندی کی رسم کی رونق بڑھاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے انہی لمحوں اور ان لمحوں میں ثقافتی تغیر کی خوش بو لیے اشفاق احمد کے افسانے ''وکھو وکھ'' کا یہ مختصر منظر ملاحظہ کیجیے جو ''گڈریا'' اور ''رشوت'' کی رخصتی کے منظر کا موازنہ آج کے جدید دور کے تقاضوں اور اندازوں سے کرتا ہوا ہمیں وقت اور لمحوں کی سرگزشت اور کلچر پر اس کے اثرات کی کہانی سناتا ہے:

''رخصتی کے وقت دولہا کار کو خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی آسٹن گاڑی تھی جس کے بونٹ پر انگریزی کا ''اے'' کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اسی دھات کے پر بنے تھے جو ''اے'' کو اُڑائے لے جاتے تھے۔ گاڑی کے پورچ سے نکلنے سے پہلے ریحانہ نے اپنی امی سے میرا نام لے کر کہا کہ وہ نظر نہیں آئے۔ اس کی امی نے اونچی اونچی آوازیں دے کر مجھے بلایا اور میں ڈرا ڈرا، سہما سہما گاڑی کی کھڑکی کے پاس آکر کہنے لگا ''اچھا بھئی ریحانہ خدا اور اللہ کے حوالے۔۔۔ خوش رہنا۔۔۔ اور اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔''

اس کے شوہر نے بیک ویو مرر گھما کر میرا چہرہ اس میں فوکس کیا اور پھر کہا کہ ''اب اجازت دیں۔ دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔ بڑا لمبا سفر درپیش ہے'' اس کے ساتھ بیٹھے والد نے بھی یہی کہا کہ ''لمبا سفر درپیش ہے، زنانہ ساتھ ہے۔ اب اجازت دیجیئے'' ریحانہ نے اسی طرح سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا ''ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے۔ پتہ نہیں کس بات کی!'' پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی جیسے کہ دلہنیں رویا کرتی تھیں۔۔۔۔''[5]

نغمۂ شادی و مسرت جہاں ایک حقیقت ہے تو وہاں نوحہ مرگ و غم بھی ایک حقیقت ہے، جس طرح ثقافت کے عروسی رنگ اشفاق احمد کے افسانوں میں بکھرے پڑے ہیں، ویسے ہی نوحۂ مرگ و غم کے ثقافتی انداز نظر آتے ہیں۔ مرگ و غم اور شادی و مسرت عالمی و آفاقی مواقع و عناصر ہیں۔ ہر خطے میں بسنے والے افراد کو ان موقعوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جہاں پیدائش ہے وہاں مرگ بھی، جہاں ہجر ہے وہاں وصال بھی، مگر ان موقعوں کو منانے اور بتانے کے انداز و طریقے منفرد اور مختلف ہوتے ہیں۔ پنجاب کے لوگوں اور ثقافت کا ان موقعوں کو منانے کا انداز منفرد نوعیت سے اشفاق کے افسانوں میں عیاں ہوتا ہے۔ پنجاب میں بین المذاہب جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ درگاہوں پر منت مانگنے والے سکھ بھی ہوتے ہیں، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ دکھ تکلیف کے وقت دم درود پر یقین رکھنے والے بھی ہیں تو جادو ٹونہ کرنے والے بھی۔ پنجاب کی ثقافت کے متنوع رنگوں سے بھرا اشفاق احمد کا افسانہ بھی ان مناظر کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے، جو پنجاب کے حقیقی کرداروں کی زندگیوں اور حیاتوں میں شامل ہے۔ اشفاق احمد کا افسانہ ''دم بخود'' اسی رنگ کا عکاس ہے اور انہی تہذیبی طریقوں پر بحث کرتا ہے۔ مادھو کا کردار ایک غیر مسلم کردار ہے جس کی بڑی بہن اُس ایک مسلم معبد و مسجد کے سامنے درود دم کی غرض لیے کھڑی ہے۔ وہ چاہے اس مذہب کی پیرو نہیں مگر اسے اس بات پر یقین ہے کہ یہاں آنے والے انسان کے مخلص اور خدا کے مقرب لوگ ہیں اور وہ دوا سے زیادہ اب دعا پر یقین رکھے ہوئے ہے۔ یہ انداز پنجاب کے بین المذاہب اخوتی رنگ کو ظاہر کرتا ہے جس کی بنیاد تفرق نہیں انسانیت پر ہے۔ مذہب یہ رنگ پر نہیں بشریت پر ہے۔ درج ذیل اقتباس دیکھئے:

''مادھو کے مرنے میں صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے اور اس کی بہن پکی سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی تھی۔۔۔ گود میں مادھو تھا، آنکھوں میں آنسو، کانوں میں پیتل کے بندے اور ہاتھ میں پانی کی بھری ہوئی شیشی۔ وہ مرتے ہوئے مادھو کو اپنے سینے سے لگائے اور پانی کی شیشی پر نگاہیں جمائے کسی ایسی دردناک فلم کا اشتہار سی لگتی تھی جس کا آج آخری شو ہو!

جب ہم مغرب کی نماز کی پڑھ کر مسجد سے نکلے تو سب سے پہلے گوگو قصائی نے گاتری کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے اسے ہلایا اور پھر کہنے لگا ''کیا حال ہے پتر مادھو بیٹے کا؟'' گاتری سسکیاں بھر کر رونے لگی تو گاگو بولا'' ہے ناں بے

قوف۔۔۔اللہ مولیٰ نے کل سویر تک فضل کر دینا ہے اور اس نے بھاگے پھرنا ہے'' پھر اس نے بسم اللہ پڑھ کر شیشی کے کھلے منہ میں پھونک ماری اور ماد ھو پر دم کر کے آگے بڑھ گیا۔

دوسرے نمازیوں میں سے بھی چند ایک بزرگوں نے شیشی پر دم کیا اور گاتری کے سر پر پیار دے کر آگے چلے گئے۔ میرے ابا چونکہ بوٹ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر آرام سے تسمے کھولتے اور باندھتے تھے اس لیے سب سے آخر میں ہم باہر نکلے۔ ابا جی نے آیت الکرسی پڑھ کر شیشی پر دم کیا اور تین مرتبہ یاحی یاقیوم اونچی آواز میں کہہ کر ماد ھو پر پھونک ماری۔

ہمارے قصبے میں اکثر، مغرب کے وقت بہت سی غیر مسلم عورتیں اور لڑکیاں پانی پر دم کرانے کے لئے مسجد کے دروازے پر موجود ہوتیں۔ نمازی ایک ایک کر کے ان کے گلاسوں، کٹوروں اور بوتلوں پر دم کرتے اپنی اپنی سمت نکل جاتے۔''[6]

محبتیں اور نفرتیں ہر سماج میں متوازی مگر مخالف متحرک ہوتی ہیں۔ اگر دکھ تکلیفیں بہت سی خدا کی دین ہیں تو بہت سی بندے کی پیدا کردہ ہیں۔ ثقافت کے دائرے میں سماج کا ہر پہلو سمویا ہوتا ہے۔ ثقافت سماج کے پہلوؤں کو رنگ، روپ اور صورت بخشتی ہے، بالکل جس طرح کوئی سانچہ کسی سیال مادے کو ڈھال کر صورت دے دیتا ہے۔ سماج میں بیماری، آفات اور دکھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا انسانی امور کے انجام میں پیدا ہونے والا درد بھی ہمہ دم گامزن رہتا ہے۔ یہ امور سماجی و سیاسی قوانین کی تحقیر اور تخریب کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ عام زبان میں انہیں جرم کہا جاتا ہے۔

دیگر سماجوں کی طرح پنجاب میں بھی جھگڑوں اور فساد کی ثقافتی صورت اور نہج و سبب بنیادی طور پر تین ہی وجوہات زن، زر، زمین پر ہے۔ زمین سے محبت اور اس پر حق جتانا پنجابیوں کی جبلت میں شامل ہے اور عورت کو عام طور پر گھر کی عزت اور چار دیواری کا مال سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح زر تو لالچ کا منبع ہے اور لالچ و طمع فتنوں کا وسیلہ بنتے ہیں۔ پنجابی غیرت اور عزت سمجھتے ہوئے زن اور زمین دونوں کی خاطر جان لینے اور دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اشفاق احمد کے کئی افسانوں میں پنجاب کے جھگڑوں کا ثقافتی انداز نمایاں ہے مگر چند حوالہ جاتی مناظر و افسانہ جات درج ذیل ہیں۔

افسانہ ''آڑھت منڈی'' عورت اور عزت کے اسی جھگڑے کی صورت بیان کرتا ہے، خاص طور پر جب افسانہ کے اختتام میں ریبی، شرفو کے کاروبار اور کارِ حرام سے واقف ہو کر اس سے بد دل ہو جاتی ہے، تو وہ گاؤں والوں کو تمام حقیقتوں سے واکر دیتی ہے۔ یہ کیفیت جھگڑے کی جو نوعیت پیدا کرتی ہے اور جو شعور اس کے پس منظر میں متحرک ہے وہ پنجاب کا ہی شعور اور منظر ہے۔ یہی درج ذیل ہے:

''اگلے دن کوئی دس سوا دس بجے شرفو سو کر اُٹھا۔ جلدی سے اپنی گھڑی دیکھی۔ چھلانگ مار کر بستر سے اُبھرا اور جلدی جلدی پمپ پہن کر کماد کے کھیت کی طرف بھاگا جہاں ریبی نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ وہاں پہنچا، اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دو شہری نوجوان بیٹل ڈریس پہنے شکار کی تلاش میں وہاں گھوم رہے تھے۔ شرفو نے کماد کے اندر، ارد گرد، آس پاس سب جگہ نظر دوڑائی لیکن اسے ریبی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اسے یقین تھا کہ ریبی آکر اور لمبا انتظار کر کے واپس چلی گئی ہے اور اب اس کے دوبارہ آنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ اس نے گاؤں واپس جانے کا ارادہ باندھا تو دور نیائیوں میں سے گاؤں کے لوگوں کا ایک غول نظر آیا جس کی قیادت چاچا نمبردار کر رہا تھا۔ شرفو کو نیائیوں سے اوپر کنارے پر کھڑا دیکھ کر ان کے قدم تیز ہو گئے اور وہ جلدی جلدی اس طرف بڑھنے لگے۔ شرفو نے ہوا میں باز و لہرا کر ان کا سواگت کیا تو حسنے تیلی نے للکار کر کہا ''اب اگر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو اسی جگہ کھڑے رہنا'' شرفو کا لہراتا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تو غول میں سے

آواز آئی ''اوئے ہماری غریبی کی جنس بیچنے والے کتے، اپنا بچاؤ کر سکتا ہے تو کر لے۔ اپنی سنبھال کر سکتا ہے تو کر لے۔ آخری موقع ہے، پھر تیری لوتھ ہی تیرے صاحب کے پاس کراچی جائے گی۔''[7]

ایسی ہی واردات کا حامل ایک اور افسانہ ''ننگ ناموس'' ہے جس کی کہانی عورت اور غیرت کے پنجابی فلسفہ کے گرد گھومتی ہے۔ عورت کا کردار مشکوک ہونے پر اُس کا خاوند بڑے سے بڑے آدمی سے بھی ٹکر لے لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات پات کی تعصباتی لکیر عبور کر کے اُن ہاتھوں تک پہنچ ہی جاتا ہے جو اس کے گھر تک اور عزت تک پہنچے۔ دارا جو کہ پیشے کا لوہار ہے اور گاؤں کا ایک کم تر شخص جانا جاتا ہے جو ملک کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا مگر جب اُس کی غیرت پر حرف آتا ہے تو وہ ملک سے بدلا لینے کے لیے پستول تو اُٹھاتا ہے مگر انتقام اُسی کے انداز میں لیتا ہے۔

بیسویں صدی میں داخل ہو کر پنجاب کی ثقافت کا رجحان اور جھکاؤ دیگر معاصر ثقافتوں کی طرح انگریزی ثقافت کی جانب ہو چکا تھا۔ لوگ زمینوں اور جائیدادوں کے معاملات کو پنچائت میں لے جانے کی بجائے عدالت اور انگریزی قاضیوں کے پاس لے جانا شروع ہو چکے تھے۔ اس نظام نے سہولت تو بہت کم دی مگر پنجاب کے جھگڑوں کو طول ضرور دیا۔ وہ معاملات جو ایک پنچائت میں نمٹ جاتے تھے اُن کا نمٹنا محال ہوا اور تاریخوں پہ تاریخ کی عدالتی روش کا آغاز ہوا۔ غاصب اس حربے سے مزید شیر و شکر ہوا اور مظلوم مزید مقہور ہوا۔ اشفاق احمد کا افسانہ ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' ثقافت کی اس صورت حال پر ہی بحث کرتا ہے۔ معاشرے کا عام کردار ''اُستاد'' شرافت اور لیاقت کے خواص کے باوجود خجالت اُٹھانے پر مجبور ہوتا دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں زمین پر جھگڑے کی کہانی کو مرکز بنایا گیا ہے جو تمام کی تمام پنجابی شعور پر بحث کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے کے چند ٹکڑے حوالہ کے طور پر درج ذیل ہیں۔ پہلا پیرا دیکھئے جو جھگڑوں کی نوعیت اور ابتداء پر دلالت کرتا ہے خاص طور پر زمین سے منسلک جھگڑوں کو مرکز بناتا ہے۔

> ''ماسٹر صاحب کے ساتھ اچانک ایسا حادثہ گزرا کہ انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ مسجد جانا چھوڑ دیا اور کچہری جانا شروع کر دیا۔ چودھری غضنفر نے ماسٹر عبدلودود کی تین کنال، گیارہ مرلے چھ سرسائی زمین مع ڈھائی کنال زمین شاملات دیہہ ہذا کے اپنے قبضے میں کر لی اور اس پر اپنے جانوروں کے لیے کچا طویلہ تعمیر کر لیا۔ چودھری صاحب کی مخالف پارٹی نورے بگے گجر نے ماسٹر عبدالودود سے چودھری غضنفر پر مقدمہ کروایا اور کورٹ فیس اور محنتانہ وکیل اپنے پلے سے ادا کر کے مقدمہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔''[8]

ان جھگڑوں کا ثقافتی طور پر حل کرنے کا انداز اور اس میں عدالتی کردار جو کہ بیسویں صدی میں پنجاب کا کلچر بن چکا تھا۔ ان سب چیزوں کا احاطہ کرتا یہ پیرا دیکھئے۔

> ''ماسٹر عبدالودود ہفتہ میں ایک دن تو اپنے وکیل کے ساتھ کچہری میں گزارتے تھے اور ایک دن مختلف درگاہوں پر منت کے دھاگے باندھ کر اور یہ کہہ کر بتاتے تھے کہ اگر مقدمہ جیت گیا اور زمین مجھے واپس مل گئی تو آدھی زمین درگاہ کے نام وقف کر دوں گا..... چودھری غضنفر کے آدمیوں نے ڈانگ سوٹا کھڑکا کے ماسٹر صاحب کو یرکانے کی کوشش کی تو وہ اور مضبوط ہو گئے اور اپنے پرانے شاگرد کی مدد سے جواب نائب تحصیل دار ہو گیا تھا، پستول کا پکا لائسنس بنوا کر لے آئے۔ چودھری غضنفر نے اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا کہ ماسٹر ودود سامنے سے آئے تو کنی کاٹ جایا کرو۔ اس کے پاس بھرا ہوا پستول ہوتا ہے، کوئی ہرج مرج ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔''[9]

اسی ماں کی مامتا اور اس کے احساس کا موازنہ دو الگ الگ صورتوں میں افسانہ ''امی'' میں پیش کیا گیا ہے۔ ماں کے دونوں کردار مشفق بھی ہیں حالات کے ہاتھوں مجبور بھی۔ گلریز کی والدہ بھی بیوہ ہے اور مسعود کی ماں بھی، مگر مسعود کی ماں یعنی حقیقی والدہ نے شادی تو مسعود کی پرورش کی

غرض سے رچالی مگر سوتیلے باپ کے امتیازی رویے اور ماں کی مجبور روشوں نے اُسے دوسری امی کے در پے لاڈالا، جہاں گلریز کی بیوہ ماں نے اسے مامتا بھی دی اور اعتماد بھی۔ ماں کے اس روپ میں جہاں سوتیلے باپ کے جابر رویے کا ثقافتی عنصر پایا جاتا ہے وہاں ماں کی مامتا کا رنگ بھی ثقافتِ پنجاب سے منسلک ہے۔

ثقافت پیہم اور متغیر سماجی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نوعیت و کیفیت میں استقلالی صورت بھی رکھتا ہے، اسی استقلالی صورت کی بدولت وہ دیگر ثقافتوں سے اختلاط و ملاپ سے محفوظ اور ممیز و ممتاز بھی رہتا ہے یہ ممتاز اور مستقل خصوصیات کسی سماج کی رسوم یا رواج کہلاتی ہیں۔ یہ رسوم اور رواج کسی ثقافت کے وہ سانچے ہوتے ہیں جس میں ہر آنے والی نسل کسی سیال مادے کی مانند ڈھلتی اور بنتی رہتی ہے۔ زندگی، موت، رہن سہن، میل ملاپ، عادات کے علاوہ تمام جملہ تکراری امور رسم و رواج کا درجہ رکھتے ہیں۔

حوالہ جات:

1 اشفاق احمد، **اماں سردار بیگم از مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص8۔

2 ایضاً، ص9۔

3 اشفاق احمد، **بیک گراؤنڈ مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص242۔

4 ایضاً، ص234۔

5 اشفاق احمد، **وکھووکھ مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص219۔

6 اشفاق احمد، **دم بخود مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص257۔

7 اشفاق احمد، **آڑھت مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص71۔

8 اشفاق احمد، **قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا مشمولہ صبحانے فسانے**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء)، ص226۔

9 ایضاً